© rasailojaraid.com

اسلام میں غیر جانب داری کا تصور

محمود احمد غازی

(دوسری اور آخری قسط)

مسلمان فقہانے بین الاقوامی تعلقات کے جو تفصیلی احکام مرتب کیے اس کی رو سے انھوں نے پوری دنیا کو مسلمانوں سے اس کے تعلق اور اس کی نوعیت کے حوالے سے مختلف خطوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تقسیم وہ ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے کی جس میں انھوں نے پوری دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب۔ امام ابوحنیفہؒ کی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ دارالاسلام سے مراد وہ علاقہ ہے کہ جہاں مسلم اکثریت ہو' اس کو وہاں اقتدار حاصل ہو اور وہاں احکام اسلام نافذ ہوں اور جہاں ان سے ایک شرط مفقود ہو گی وہ دارالحرب ہو گا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کے قرب و جوار میں جو ممالک تھے ان سب کو دارالحرب کہا گیا' اس لیے کہ ان میں سے قریب قریب سب سے عملاً جنگ جاری تھی (مثلاً رومی قریبی ہمسائے تھے اور ان سے جنگ جاری تھی۔ مصر کے قبطیوں سے جنگ جاری تھی۔ اسپین میں قشتالیوں سے جنگ جاری تھی)۔ اس لیے فقہاے اسلام میں سے بہت سے حضرات نے اصول یہ قرار دیا کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات کے باب میں اصل جنگ ہے الاصل فی علاقات المسلمین بالکفار الحرب۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ ان سے بالفعل حالت جنگ قائم ہے لہٰذا ان کی طرف سے کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے' ان سے غافل نہ رہنا چاہیے بلکہ ہر لمحے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں بعض فقہانے یہ کہا کہ اصل یہ ہے کہ تعلقات پر امن ہوں اور حالت جنگ ایک عارضی کیفیت ہے۔ اول الذکر حضرات نے حکمت عملی کے پیش نظر اور مسلمانوں کو متحرک رکھنے کی نیت سے جب غور کیا تو محسوس کیا کہ جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے قرار دیا کہ حالت جنگ ہی مسلمانوں کے درمیان اصل ہے اور امن ایک عارضی کیفیت ہے۔ جیسا کہ وہ فی الواقع تھی بھی۔ ان حضرات نے جنگ کو اصل اس لیے قرار دیا کہ مسلمان تو بلاجواز جنگ کے قائل ہی نہیں ہیں' اور جنگ ہمیشہ غیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلموں ہی کی طرف سے مسلط کی جاتی رہی ہے' اس لیے یہی اصل ہے۔ تاریخ سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ جب بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ ہوئی' وہ غیر مسلموں کی آغاز کردہ اور ان کی مسلط کردہ تھی۔

یہ نقطہ نظر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کا ہی نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے مفکرین ان سے قبل بھی اس نقطہ نظر کے حامل رہے ہیں۔ یہ بات امام صاحب سے ایک ہزار سال قبل افلاطون نے بھی کہی ہے کہ تعلقات کی نوعیت متمدن اور غیر متمدن دنیا میں جنگ ہے' اور متمدن دنیا کا یہ فرض ہے کہ وہ غیر متمدن دنیا کے خلاف مسلسل مار دھاڑ اور جنگ و جدال جاری رکھے اور ان کو اپنی پیروی پر مجبور کرے۔ اسی طرح کے تصورات دیگر اقوام میں بھی موجود رہے ہیں۔ جن فقہاے کرام نے تعلقات میں اصل جنگ کو قرار دیا ہے' وہ اس کے تین تصورات بیان کرتے ہیں اور ان تینوں سے تین علیحدہ علیحدہ احکام نکلتے ہیں جن کی پیروی مسلم حکمرانوں کو کرنی چاہیے۔ اگر نظریہ یہ ہے کہ مسلمان دوسروں سے نظری طور پر برسرجنگ رہے' چاہے وہ جنگ عملی طور پر پچاس سال تک نہ ہو' گویا ہنگامی حالت کا نفاذ برقرار رہے کہ کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے تو اس صورت میں مسلمان' دشمن کے مقابلے میں کوئی مستقل عدم جنگ کی پالیسی نہیں اپنا سکتے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ محض محتاط ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لیے تیاری کی ضرورت بھی ہے۔ اگر دشمن پرامن تعلقات کو اچانک ختم کر کے برسرپیکار ہو جائے اور یہ خطرہ ہمہ وقت موجود ہو تو اس کے لیے حکم ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ' قرآن مجید کا یہ حکم اسی صورت حال کے لیے ہے۔ یہ حکم ہے ہی اس لیے کہ دشمن اسلام ہمیشہ مسلمانوں کے رعب و دبدبے کا شکار رہے۔ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ کہ تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو اور جو آنے والے ہیں جن کو تم نہیں جانتے ان کو رعب و خوف (deterrence) کی کیفیت میں رکھو تاکہ تمھارا دشمن اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے اور مسلمانوں پر جنگ مسلط نہ کر سکے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کو متحرک اور سرگرم رکھنے کے لیے اور ایک عام مسلمان کے جذبہ جہاد و قتال کو زندہ رکھنے کے لیے کہ وہ نظری طور پر جنگ کے لیے تیار رہے' ایسا تصور ناگزیر ہے۔ اگر نظری طور پر ایسا کیا جاتا رہے تو مسلمانوں کو یہ بتایا جائے گا کہ انھوں نے بالآخر دشمن کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب تعلقات میں اصل جنگ ہو اور نووار پیکٹ (معاہدہ عدم جنگ) عارضی ہو۔ درمیان میں بظاہر امن کا وقفہ ہے' یہ کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔

یہ تقسیم تو وہ ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کی' کی ہوئی ہے اور اس تصور کی بنیاد پر وہ دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر وہ علاقہ جس سے مسلمانوں کے تعلقات پُرامن ہوں' وہاں اسلامی ریاست کی بالادستی کو تسلیم کیا جاتا ہو اور وہاں اسلامی ریاست کا سِکّہ چلتا ہو تو وہ امام ابوحنیفہؒ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعریف کی رو سے دارالاسلام اور دوسرے ائمہ کی تعریف کی رو سے دارالصلح ہے۔ اگر وہاں اسلامی شریعت کو بالادستی حاصل نہیں یا اسلامی اسٹیٹ کی سیاسی برتری کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو وہ دارالحرب ہے۔ اس لیے امام صاحب کے نزدیک دارالعہد یا دارالصلح کوئی منفرد یا مستقل علاقہ نہیں ہے بلکہ دارالاسلام یا دارالحرب ہی کا ایک حصہ ہے۔

اس کے مقابلے میں امام شافعیؒ اور کئی دیگر فقہا کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پوری دنیا تین حصوں میں منقسم ہے: ۱۔ دارالاسلام، جہاں اسلام کی بالادستی ہو۔ ۲۔ دارالحرب یا دارالکفر جہاں مسلمانوں کا قانون نہ چلتا ہو اور وہاں غیر مسلموں کی بالادستی ہو اور وہاں اسلامی ریاست کی سیاسی برتری تسلیم نہ کی جاتی ہو۔ ۳۔ دارالعہد یا دارالصلح جہاں مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار اور پرامن ہوں اور جن سے مستقبل میں کسی قسم کی منافرت یا لڑائی کا امکان نہ ہو۔

اسی کے ساتھ ایک اور تقسیم بھی ہے جو تمام فقہا نے کی ہے۔ یہ دار الاسلام اور دارالعہد کے درمیان ایک قسم ہے جو دارالبغی کہلاتی ہے، یعنی وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کے باغیوں کا قبضہ ہو جائے۔ فقہی اعتبار سے یہ ایک عارضی تقسیم ہے تاہم غیر جانب داری کے تعلقات ان سے بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ ویسے دراصل باغیوں کا علاقہ بھی دارالاسلام ہی کہلائے گا کہ وہاں حکمرانی مسلمانوں کی ہی ہو گی اور وہاں نفاذ احکام اسلام کا ہی ہو گا، فرق صرف یہ ہے کہ یہ وہ علاقہ ہے جو باغیوں نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ پہلے عرض کیا گیا تھا کہ ایسے مسلمانوں کا گروہ جو شریعت کے کسی حکم کی تاویل کی بنا پر اسلامی ریاست سے علیحدہ ہو گیا ہو اور جس کے پاس اپنی ایک مستقل سیاسی اور عسکری قوت ہو اور وہ کسی علاقے پر قابض ہو کر اپنا الگ نظم قائم کر لیں، ایسے علاقے کو دارالبغی اور وہاں کے باشندوں کو اہل البغی کا نام دیا گیا ہے۔ ان لوگوں سے تعلقات کا ایک الگ قانون ہے جس کی تفصیلات فقہائے کرام نے حضرت علیؓ کے طرز عمل سے اخذ کی ہیں۔ دارالبغی میں بعض اوقات غیر جانب دار علاقے بھی بن سکتے ہیں اور ان سے مسلمانوں کا ایک عارضی پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ ماضی میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں خوارج کے ساتھ ان کے تعلقات اس معاملے میں بہت سے نظائر فراہم کرتے ہیں، اور دارالبغی اور دارالحرب کے فرق کو ان کے جداگانہ احکام کے لحاظ سے ممیّز کرتے ہیں۔

دوسری طرف امام شافعیؒ جس علاقے کو دارالصلح کہتے ہیں، یہ وہ علاقہ ہے جس سے مسلمانوں کا کوئی پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ ہوا ہو یا مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات پرامن ہوں، وہاں رہنے والے مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کی کھلی آزادی ہو اور ان کے لوگوں کو عام مسلمانوں کے ساتھ میل جول کی عام اجازت ہو۔ اس سلسلے میں امام شافعیؒ اور ان کے رفقا عہد نبویؐ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نجران کے علاقے کی مثال بیان کرتے ہیں۔ نجران کا علاقہ عیسائی اکثریت کا علاقہ تھا۔ حضور علیہ السلام نے ان سے معاہدہ کیا اور اس معاہدے کے نتیجے میں مقامی طور پر انھیں خود مختاری دی گئی۔ ان کے تمام ادارے اسی طرح قائم رہے، ان کا مذہبی نظام اسی طرح موجود رہا۔ معاہدے میں واضح طور پر یہ لکھا گیا کہ ان کا مذہبی نظام علیٰ حالہ باقی رہے گا۔ اس کے مقابلے میں وہ اسلامی ریاست کی عمومی بالادستی قبول کر کے اس کو خراج ادا کریں گے۔ امام شافعیؒ اس علاقے کو دارالصلح کہتے ہیں اور اس کو دارالحرب سے ایک علیحدہ مستقل علاقہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اسے دارالاسلام قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کر لی ہے اور اسلامی ریاست کی شرائط تسلیم کر لی ہیں۔

اسی طرح سے حضور علیہ السلام جب مدینہ تشریف لائے اور مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی تشکیل کا کام مکمل ہو گیا تو آپؐ نے آس پاس کے بعض قبائل سے معاہدے کیے جن میں بنو سلیم اور جہینہ نامی قبیلے نمایاں تھے۔ ان سے دوستی اور عدم جنگ کے معاہدے کیے۔ ایک قبیلہ جن سے جنگ بدر کے قریب معاہدہ کیا گیا اور جس میں طے کیا گیا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ نہ کریں گے اور مسلمان ان پر حملہ نہ کریں گے۔ اگر اسلامی ریاست کسی بیرونی طاقت کے خلاف جنگ کرے گی تو یہ اس کی مدد کے پابند نہ ہوں گے۔ البتہ اگر کوئی غیر مسلم طاقت مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو تو یہ اس صورت میں مدد دیں گے۔ یہ واقعتاً ایک بین الاقوامی نوعیت کا معاہدہ ہے جس میں ایک مسلم ریاست نے دوسری آزاد ریاست سے برابری کی سطح پر تعلقات قائم کیے ہیں۔ یہ انتظام ۲ ہجری سے کم از کم ۸ ہجری تک قائم رہا، تا آنکہ پورے قبیلے نے ۸ ہجری میں اپنی مرضی سے مدینہ منورہ آکر برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا، اس لیے کہ رسول اللہؐ کا حکم تھا کہ جو اسلام قبول کرے وہ مدینہ آکر رہائش پذیر ہو جائے۔ اس طرح ان میں سے بہت سے لوگ وہاں رہائش پذیر ہو گئے لیکن اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے والے نو مسلموں کو مدینہ آنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ یہ ۲ ہجری سے ۸ ہجری تک پانچ سال کا عرصہ ہے۔ امام شافعیؒ کی اصطلاح میں یہ دارالصلح ہے۔ یہی چیز بنو سلیم اور دیگر ایسے قبائل پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے اس ضمن میں مکہ مکرمہ کی مثال بھی دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ سے چند ماہ پہلے تک مکہ مکرمہ کو غیر جانب دار علاقہ تصور کیا جائے گا اس لیے کہ اس میں اہل مکہ سے تجارت ہوتی تھی، آمدورفت کی کلی آزادی تھی، پرامن تعلقات کے جملہ عوامل موجود تھے، تجارتی معاملات قائم تھے، آزادی سے لین دین ہو رہا تھا۔ اس طرح امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ایک غیر جانب دار علاقہ یا دارالصلح تھا۔ اور جب تک کہ ابوسفیان اور دیگر سرداران مکہ نے اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی، یہ دارالصلح ہی شمار ہوتا رہا۔

تقریباً یہی کیفیت فدک کے معاملے کی ہے۔ فدک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاہدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمایا اور یہودیوں کے ساتھ بعض شرائط طے کیں۔ وہ اگرچہ اس برابری کی بنیاد پر تو نہ تھیں جس برابری کی بنیاد پر قریش مکہ سے شرائط طے کی گئی تھیں کیونکہ اس میں یہودیوں کی حیثیت بہت کمزور تھی اور مسلمانوں کی حیثیت کافی مضبوط تھی۔ لیکن اس علاقے کو مفتوحہ علاقہ قرار نہیں دیا گیا اور وہاں کی زمینوں کو اس طرح مکمل سرکاری ملکیت میں نہیں لیا گیا جس طرح دیگر مفتوحہ علاقے فتح کر لیے گئے۔ اس اعتبار سے فدک کو شبہ دارالصلح کہا جا سکتا ہے۔

لیکن دارالصلح اور غیر جانب دار علاقہ کی سب سے زیادہ نمایاں مثالیں جو ہو سکتی ہیں وہ دو ہیں: ایک حبشہ کا علاقہ، دوسرا ترکی کا۔ حبشہ سے مسلمانوں کے تعلقات ابتدا سے ہی قائم ہو گئے تھے اور اس کو حضورؐ نے بھی ارض عدل و قسط قرار دیا تھا۔ وہاں مسلمان گئے اور عرصہ دراز تک رہے۔ وہاں کی حکومت سے مدینہ کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے ہدایت فرمائی جب تک "حبشی" تم پر حملہ نہ کریں تم بھی ان پر حملہ نہ کرو۔ (دعوا الحبش ما ودعوکم)۔ ایک اور موقع پر فرمایا جب تک وہ تم کو چھوڑے رہیں تم بھی ان کو چھوڑے رہو (اترکوا الحبش ما ترکوکم)۔ اس ارشاد کی مسلمانوں نے ہمیشہ پیروی کی اور آج تک پیروی کر رہے ہیں۔ کوئی اسلامی سلطنت ایسی نہ تھی اور نہ ہے جس نے حبشہ پر حملہ کیا ہو۔ حبشہ میں مسلمانوں پر مظالم بھی ہوئے لیکن مسلمانوں نے کبھی اس پر حملہ نہ کیا۔ کم و بیش ایک ہزار سال تک حبشہ سے تعلقات نہایت اچھے رہے اور فریقین نے غیر جانب داری کا مکمل طور پر ثبوت فراہم کیا۔

یہی کیفیت اور یہی معاملہ نوبیا کا رہا ہے جو سوڈان کا ایک علاقہ ہے۔ یہ علاقہ عثمانی ترکوں کے دور میں اسلامی ریاست کا حصہ رہا۔ آج اس کا بڑا حصہ سوڈان میں شامل ہے اور غالباً یہی وہ علاقہ ہے جس سے حضرت بلالؓ کا تعلق تھا۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں جب حضرت عبداللہ ابن سعدؓ بن ابی سرح مصر کے گورنر تھے تو ایک طویل جنگ جسے مورخین نے قتال کبیر کے نام سے یاد کیا ہے، مسلمانوں اور نوبیا کے درمیان ہوئی جس میں فریقین میں سے کسی کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس جنگ میں نوبیوں نے پیش کش کی کہ ہم بقائے باہمی کے اصول پر صلح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس پیش کش کے نتیجے میں عبداللہؓ ابن سعد ابن ابی سرح نے ان سے معاہدہ کر لیا۔ معاہدہ یہ تھا کہ نوبی سالانہ خراج ادا کریں گے جن میں کچھ جانور بھی ہوں گے، اس کے مقابل مسلمان ان کو خوراک فراہم کریں گے۔ فریقین کے مابین آپس میں سلسلہ آمدورفت بھی رہے گا۔ آپس میں جنگ نہ ہو گی، اگر مسلمانوں کی کسی سے جنگ ہو گی تو نوبیا کے لوگ کسی فریق کا ساتھ نہ دیں گے اور اگر نوبیا کسی سے برسرپیکار رہا تو مسلمان بھی فریقین میں سے کسی کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ معاہدہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کو بھیجا گیا۔ آپؓ نے دیگر صحابہؓ کے مشورے سے اس کو قبول کیا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں ہونے والے اس معاہدے پر چھ سو سال تک عمل ہوتا رہا اور اس طویل عرصے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی فریق نے اس معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی۔ بنو امیہ اور بنو عباس کا دور گزر گیا، جب مصر پر فاطمیوں کا قبضہ ہوا تو انھوں نے اپنے آخری دور میں اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ پھر ممالیک کا دور شروع ہوا تو اس وقت اس معاہدے کی پابندی نہ کی جا سکی۔ اس کے کیا اسباب تھے یہ ایک علیحدہ اور طویل بحث ہے جو اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تھے، کچھ کا خیال ہے کہ وہاں مسلم اقلیت پر مظالم ہو رہے تھے، کچھ کہتے ہیں کہ اس جنگ کی ابتدا چند تخریب کار لوگوں نے کی۔ بہرحال یہ چھ سو سال کا طویل عرصہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے پرامن بقائے باہمی کے تعلقات نوبیہ، حبشہ اور ترکی وغیرہ کے غیر مسلموں سے رہے ہیں اور انھوں نے صدیوں تک اپنے معاہدوں کی پاسداری کی ہے۔ حبشہ، نوبیا، نجران وغیرہ اس سلسلے کی مثالیں ہیں۔

اس سلسلے کی ایک اور اہم مثال آرمینیا کی ہے۔ وہاں حضرت عثمانؓ کے دور میں مسلمان پہنچ گئے تھے اور ایک سال تک وہاں قتال جاری رہا۔ قتال کا کوئی حتمی نتیجہ نہ نکلنے کی وجہ سے فریقین کا باہمی معاہدہ ہو گیا جس کے نتیجے میں صلح ہو گئی۔ مسلمانوں نے صدیوں اس معاہدے کا احترام کیا اور سات سو سال کے لگ بھگ ان سے صلح کے تعلقات قائم رہے۔ پھر جب ترکوں کا عروج شروع ہوا اور مسلمانوں کو اس علاقے میں بالادستی حاصل ہو گئی تو انھوں نے اس معاہدے کی پابندی نہیں کی۔ یہ وہ بڑی مثالیں ہیں جو اسلام کے غیر جانب داری کے تصور کو واضح کرتی ہیں۔

حضرت امام رازیؒ نے مذکورہ آیت کریمہ (یعنی فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ) کی تفسیر میں ایک معاہدے کا ذکر کیا ہے جو حضورؐ اور قبیلہ بنو سلیم کے درمیان ہوا تھا جس کے مطابق یہ طے ہوا کہ فریقین میں کوئی ایک فریق دوسرے فریق سے متحارب کسی قوم یا گروہ کی مدد نہ کرے گا۔ اور دونوں فریقوں میں سے اگر کسی فریق کا کوئی فرد دوسرے فریق کا انفرادی طور پر ساتھ دینا چاہے تو دے سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرا فریق ان میں سے کسی ایک فریق کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ کر سکے گا جس پر دوسرے معاہد کو اعتراض نہ ہو گا۔ اس طرح کی ایک مثال صلح حدیبیہ میں بھی ہے کہ بعد از صلح ایک قبیلے نے کفار مکہ کا ساتھ دینا چاہا جس پر مسلمانوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ایک قبیلے نے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا جس پر کفار مکہ نے اعتراض نہ کیا۔ ان دونوں معاہدوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی دو فریقی معاہدے میں اگر کوئی تیسرا فریق، گروہ یا قوم فریق بننا چاہے تو دونوں معاہد فریقوں کی رضامندی سے شریک ہو سکتا ہے، جیسا کہ یہ دونوں معاہدہ حدیبیہ میں شامل ہوئے۔

اس علاقے کو جہاں اس قسم کا معاہدہ ہوا ہو، امام شافعیؒ اور دوسرے فقہائے اسلام دار الصلح کہتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقہاے احناف اسے دارالموادعہ قرار دیتے ہیں۔ دارالموادعہ احناف کے ہاں دارالحرب ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لیے کہ وہ موادعہ' ایک قسم کی عارضی جنگ بندی کو کہتے ہیں۔ امام سرخسیؒ شرح السیر الکبیر میں لکھتے ہیں: ان دار الموادعہ دار حرب' لا یجری فیہا حکم المسلمین۔ یعنی دارالموادعہ دراصل دارالحرب ہی کا ایک حصہ ہے' اس لیے وہاں مسلمانوں کے قوانین نافذ نہیں ہیں۔ نظری طور پر اگرچہ دارالموادعہ ایک عارضی چیز ہے لیکن عملی طور پر احناف نے اسے بھی ایک جداگانہ قسم کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ یہ نظری جنگ بندی جیساکہ آپ نے اوپر ابھی دیکھا ہے کہ صدیوں تک جاری رہی۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ احناف و شوافع کا اختلاف کوئی بنیادی اصولی اختلاف نہیں ہے' بلکہ اکثر و بیشتر محض اصطلاحات کے فرق سے عبارت ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت علیؓ سے منسوب ہے جس کا ذکر ان کے مواعظ نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ اس کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے' لیکن یہ حوالہ جو میں دے رہا ہوں' یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اگر من و عن بھی اس کو درست تسلیم کر لیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے وہ قرآن وسنت سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ حضرت علیؓ کا ایک خط ہے جو انھوں نے گورنر مصر کے نام لکھا تھا۔ مصر کی حدود اس دور میں لیبیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس خط میں گورنر کو یاد دلایا گیا تھا کہ غیر جانب داری کے معاملات پر خاص توجہ دی جائے۔ انھوں نے لکھا کہ اگر تمارا دشمن تمھیں صلح کی دعوت دے تو اسے کسی صورت مسترد نہ کرو۔ اس لیے کہ جب تم صلح کر لو گے تو تمھاری فوجوں کو تازہ دم ہونے کا موقع ملے گا اور تم کچھ اطمینان کا سانس لے کر آیندہ حالات کا بہتر تجزیہ کر سکو گے۔ نیز اس سے ملک کو امن و امان سے چلانے' عوام کی خدمت کرنے کا موقع فراہم ہو گا لیکن اس کے باوجود لکھا کہ ہروقت دشمن سے چوکنا اور محتاط رہو۔

فقہاے کرام نے ایک سوال یہ اٹھایا ہے کہ کیا صلح کے تعلقات یا جنگ بندی کی کوئی مدت مقرر ہونی چاہیے؟ چنانچہ عام طور سے فقہاے احناف نے اس کی کم سے کم مدت چار ماہ مقرر کی ہے' یعنی کوئی موادعہ کم از کم چار ماہ کی مدت سے لے کر زیادہ سے زیادہ عرصے پر محیط ہو سکتا ہے۔ چار ماہ سے کم مدت کا معاہدہ عارضی موادعہ تصور ہو گا' گویا چار ماہ سے کم کا معاہدہ آج کی اصطلاح کے مطابق سیزفائر ہو گا اور اگر زیادہ ہے تو موادعہ یا مہادنہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ احناف اس پر قرآن پاک سے استدلال کرتے ہیں کہ مدت معاہدہ چار ماہ ہو' لیکن بہت سے فقہا نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ مدت کے بارے میں فقہا نے کوئی خاص مدت مقرر نہیں کی' کم سے کم مدت کے لیے ان کا استدلال صفوان بن امیہ کے واقعہ پر مبنی ہے جو چار ماہ کے لیے تھا۔ اسی طرح بعض فقہا نے زیادہ سے زیادہ مدت دس سال بیان کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ کوئی معاہدہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ یہاں ان کا استدلال صلح حدیبیہ سے ہے جس کی مدت دس سال مقرر کی گئی تھی۔ اکثر فقہا کا کہنا ہے کہ مدت کا تعین کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ ضرور اس کا تعین کیا جائے۔ حالات کے مطابق علماے وقت یا حکام اس کا اپنی صوابدید کے مطابق تعین کر سکتے ہیں۔ خود فقہاے احناف میں بھی اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ مشہور محدث، فقیہ اور شارح بخاری علامہ بدر الدین عینی نے کہا ہے کہ یہ حکومت کی صوابدید پر ہے کہ اگر مسلمانوں کا مفاد مدت کے تعین میں ہو تو تعین کر لیا جائے اور اگر مسلمانوں کا مفاد مدت کے عدم تعین میں ہو تو مدت کو طے نہ کیا جائے۔ بخاری کی شرح میں انھوں نے یہی لکھا ہے لیکن اس بات میں کبھی بھی اختلاف نہیں رہا کہ جب مسلمانوں کا کسی دیگر فریق سے معاہدہ طے پا گیا تو اس معاہدے کی بنیاد پر تعلقات کا سارا دارومدار اور ان کی بقا کا انحصار ہو گا۔ غیر مسلم کی جان، مال اور عزت کو مکمل تحفظ دینا ہو گا اور اس کی کسی صورت خلاف ورزی نہ ہو گی۔

اسی طرح کا ایک معاہدہ سیدنا معاویہؓ کے زمانے میں رومیوں سے ہوا تھا اور اس معاہدے کے نتیجے میں وہ طویل جنگ ختم ہو گئی تھی جو رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان رومیوں کی نالائقی کی بنا پر چھڑ گئی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے پہلی بار اس معاہدے پر اپنے طور پر عمل کیا اور جس میں کم و بیش یہی شرائط رکھی گئی تھیں۔ یہ معاہدہ بھی تقریباً چھ سو سال تک جاری رہا جس میں طویل وقفوں کے بعد رومیوں کی طرف سے خلاف ورزی بھی ہوتی رہتی تھی، مثلاً صلیبی جنگوں میں ان کی طرف سے خلاف ورزی ہوئی۔ اس کے بعد جنگ طرابلس میں ان کی طرف سے خلاف ورزی ہوئی۔ پھر اسپین کی فتح کے بعد عثمانی ترکوں کے ساتھ انھوں نے معاہدے کیے اور ان کی خلاف ورزی کی۔

موادعین کی جان و مال کے تحفظ کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے اور یہ شریعت کا اصول ہے کہ اگر کسی ایسے علاقے کے غیر مسلم باشندے کی جان و مال کا نقصان ہو گا تو اس کا قصاص لیا جائے گا یا اس کو دیت دی جائے گی، دونوں میں سے کسی ایک کا تعین حالات اور معاملے کی نوعیت کے مطابق ہو گا۔ احناف کا کہنا ہے کہ مجرم سے قصاص لیا جائے گا جب کہ دیگر فقہا دیت کی ادائیگی کے قائل ہیں، لیکن جان و مال کے تحفظ پر سب کا اتفاق ہے۔ مشہور فقیہ امام سرخسی نے لکھا ہے کہ عارضی جنگ بندی کی صورت میں بھی مسلمان غیر مسلموں کی جان و مال، عزت و آبرو کے محافظ رہیں گے اور اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں گے۔

اس سلسلے میں ایک بڑی نمایاں دستاویز جو شروع سے نظر آتی ہے اور جس کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے پرامن بقاے باہمی کے تعلقات کی بنیاد قرار دینا چاہیے، وہ دستاویز ہے جو رسولؐ اللہ نے یہودیوں کے ساتھ مرتب فرمائی جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بڑا دشوار ہے کہ آج کی آئینی یا قانونی دفعات کی شکل میں اسے بیان کیا جائے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس دستاویز میں یہودی و مسلم قبائل دونوں کو اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی جگہ ایک قوم قرار دیا گیا اور ان کی اپنی اپنی داخلی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا' مثلاً اس میں تسلیم کیا گیا کہ وہ اسی طرح اپنے علاقے کا نظام چلاتے رہیں گے جس طرح وہ اس معاہدے سے پہلے چلا رہے تھے اور وہ اپنے اپنے علاقے کے مالک اور مختار ہوں گے۔ یہ دفعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے ایک ایسا نظام قائم کیا جا رہا ہے جس کو ایک نیم وفاقیہ کا نام دیا جا سکتا ہے' جس میں گویا دو خود مختار فریقوں نے مل کر یہ معاہدہ کیا تھا۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ اگر کسی دینی معاملے میں جنگ کی نوبت آئے تو یہودی مسلمانوں کی مدد کے پابند نہ ہوں گے۔ یہ بات بڑی اہم ہے اور اس کو غیر جانب داری کی مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مسلمان دینی معاملے میں کسی غیر مسلم طاقت کی مدد نہ لیتے تھے اور نہ اسے پسند کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ان کو بلایا جائے گا تو یہ ان کی ذمے داری ہو گی کہ وہ اس پر لبیک کہیں' سوائے اس معاملے کے کہ جس میں دین کے دفاع یا نفاذ کی بات ہو۔ یہودیوں کو اسلام کے اور مسلمانوں کو یہودی مذہب کے دفاع کے لیے نہیں بلایا جائے گا۔ ہاں اگر شہری ریاست کی سطح پر کوئی جنگ ہو گی تو فریقین باہمی تعاون کریں گے۔

آخر میں ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جو آج کل کے قوانین اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے ناقابل تصور ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کا دور نفاق کا دور ہے' دلوں میں کچھ ہوتا ہے اور زبانوں پر کچھ ہوتا ہے۔ دیانت داری اگر کوئی اختیار کرتا بھی ہے تو محض پالیسی کے طور پر۔ فقہاے اسلام کے بہت سے فتوے ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جس بات پر عمل نہیں کرنا اس کو معاہدے میں نہ لکھا جائے' نہ کہا جائے اور نہ مانا جائے اور جس چیز کا ایک بار وعدہ کر لیا جائے' اس پر پوری باریک بینی سے عمل کیا جائے۔ اس بنا پر مسلمانوں نے جب یہ طے کیا کہ فلاں قوم سے معاہدہ کرنا ہے' وہ چاہے چھ سو سال کے لیے ہو یا چند لمحات کے لیے' تو انھوں نے یہ سوچ کر کیا کہ اس معاہدے کے تقاضے بہرصورت پورے کیے جائیں گے۔ ماوردی مشہور آئینی محقق ہیں' ان کی کتاب الحاوی الکبیر چوبیس جلدوں میں ہے' اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا جب کسی ملک سے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جائے اور حالات پرسکون اور پرامن ہو جائیں تو اس کے فریقین کے سامنے دو ہی راستے ہیں' یا تو پہلے سے اعلان کر کے نوٹس دے کر معاہدہ ختم کر دیں ورنہ اس کے تقاضوں پر عمل کریں۔ معاہدے پر عمل درآمد کے تین تقاضے ہیں:

۱۔ پہلا تقاضا یہ ہے کہ تمام معاملات میں مکمل جنگ بندی کی جائے' یعنی مسلمان ان سے جنگ نہ کریں اور ان کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ جو حقوق اپنے لیے مسلمان مانگتے ہیں وہ ان کے لیے بھی پسند کریں' جو ذمے داریاں اپنے لیے قرار دیتے ہیں وہ ان کے لیے بھی قرار دیں۔ جیسے مسلمانوں کو اپنی آزادی عزیز ہے اسی طرح ان کے لیے ان کی آزادی کو پسند کریں اور معاملات کا وہی تصفیہ ان کے لیے ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو اپنے لیے ہو۔

۲۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ چھپ کر ان کے خلاف مسلمان خیانت یا غدر کا معاملہ نہ کریں۔ خفیہ طور پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں اور کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس سے معاہدے کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہو۔

۳۔ تیسرا تقاضا یہ ہے کہ قول و فعل میں ان کے ساتھ مکمل مجاملہ کا سلوک کریں۔ یعنی ان کے ساتھ اخلاق، صفائی اور برابری کا معاہدہ۔ اگرچہ اس لفظ یعنی مجاملہ کا اردو میں ترجمہ مشکل ہے لیکن اس کی مثال جو ماوردی نے دی ہے اس سے اس کے مفہوم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مثال یہ ہے کہ مسلمان ان کی غیبت اور عیب جوئی تک سے احتراز کریں، وہ مسلمانوں کی عیب جوئی نہ کریں، مسلمان ان کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ نہ کریں اور وہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کا اقدام نہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاق و کردار کا اس سے بڑا تصور آپ کو اور ہمیں کہیں نہ ملے گا۔

اشاعت خاص: خرم مراد
حیات و خدمات

ماہنامہ آئین، لاہور

خصوصی مجلس ادارت
○ مسلم سجاد
○ حسن صہیب مراد
○ سلیم منصور خالد

مظفر بیگ

ان شاء اللہ اکتوبر ۹۷ میں شائع ہو رہا ہے

نسیم مارکیٹ، ریلوے روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com